

# يا خذ

قدرة الله تعالى



الله تعالى

قدرة الله تعالى

الله تعالى

قَدَرَتِ اللّٰهُ شَهَابٌ

يَا خُذَا

## ترتیب

### اس کمائی کی کمائی

جو قدرت اللہ شہاب نے خاص اس ایڈیشن کے لیے لکھی ہے

### رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ

توہی دنیا میں میں محکوم و مجبور

### رَبُّ الْمَغْرِبِينَ

ہری دنیا میں تیری پادشاہی

### رَبُّ الْعَالَمِينَ

مجھے شکر جاں کیوں ہو جاں تیرا ہے یا میرا

## اس کہانی کی کہانی

ستمبر ۱۹۴۴ء کا مہینہ تھا اور ہندوستان بے فٹ پٹ کر آنے والے مجروح قانون کا تانتا بندھا ہوا تھا جو پہلے آگئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واگہ پار کی بے کراں پہنائی میں گم تھا۔ اکثر کا یہ انتظار مومہم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیاروں کے جانگزا انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عزیزوں کو پا لیتے تھے لیکن کم۔ مایوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔ میں بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چچا زاد بھائی نعمت اللہ شہاب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھر اگتی تھیں۔ نعمت اللہ میرا چچا زاد بھائی

مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیہ حیات میں

لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے



ہی نہ تھا، لگوٹیا دوست بھی تھا جس کے ساتھ چکور کے سکول میں میں نے کیا کیا  
 دھو میں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کا ماسٹر تھا اور  
 اپنی سبک دین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بھڑکے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا  
 کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، مجھے کچھ خبر  
 نہ تھی۔ بہر حال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی  
 نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک روز آیا، لیکن میں اسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متجسس دیکھتا  
 ہوا میں اس کے پاس سے دو تین بار گزر گیا، آخر اس نے خود مجھے 'قدرت' کہہ  
 کے آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور تھا اس منہس لکھ ایلیے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا مادہ  
 ہڈیوں کا ڈھانچہ لباس خون آلود، چہرہ غبار آلود۔ میں نے پوچھا۔ "نعمت! بھائی  
 کہاں ہے؟" وہ رو دیا اور اپنے پاس بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت  
 کا چہرہ داغ داغ تھا۔ صبح چہرے کی کھال جیسے جلتی ہوئی آہنی سلاخوں سے  
 داغ دی گئی ہو۔ ہوا بھی ہی تھا، اس ہمت اور غیرت والی خاتون نے اپنا چہرہ خود  
 داغ تھا تاکہ کیمپ میں آنے والے شکاریوں کی نظر ہوس سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ  
 نہ داغی تو اس وقت واگہ کے اس پار نہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سارا جسم  
 داغ چکا ہوتا۔ نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہوا کہ چند سوراخوں نے کیمپ  
 کے کنوئیں میں نیلا تھوٹا گھول دیا تھا۔ بعضے اس آب حیات کو پی کر کیمپوں میں زندہ

جادید ہو گئے، نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ  
 گئیں۔ نعمت اللہ اسی روز۔ اس ارض موعود میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بار  
 حیات آمار کر کسکا رہ گیا۔ وہ عقیقہ اس کی بیوی تیسرے روز پھل بسی اور میں جراتے  
 دنوں سے منتظر تھا۔ خالی ہاتھ کراچی واپس آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا رات  
 بھر اس کی روشنیاں جلتی۔ میں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا، نعمت اللہ کی  
 کہانی۔ اپنے گاؤں چکمر کی کہانی۔ اپنے گاؤں کے قلعہ علی بخش کی بیٹی دشا کی کہانی۔  
 کیمپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھ۔ حجاج ہمنوں کا شکار کرنے  
 والے ہمت سے بھائی جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے، مولوی خدام خلق  
 قوم کے لیڈر اور سیاست دان سبھی اصلی کردار ہیں۔ میں نے انہی کے نام نہیں لکھے۔  
 ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے وزیر مملکت بھی بنایا۔ خدا جسے چاہے جو عزت  
 دے دے اس کی مصیبتیں وہی جلتے۔

اس کہانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنگارا آنکھوں  
 نے کراچی کے عید گاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔  
 یہیں دشا دیا اس نام کی عورتیں مجھے کپڑے ملتی، پہنتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے  
 کہانی بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا، میں میں لے آؤں۔ اور کسی کے ساتھ میں  
 لینے چل دیں۔ یہ کپڑے برسوں سے جاتے رہے اور بکتے رہے، شاید اب بھی ان

میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار تھے 'مزدور یا بھگ سنگے' اس ارض موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔

۱۹۳۷ء ابھی ختم نہیں ہوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہوئی۔

کراچی کے بعد میرا تقرر لاہور میں محکمہ صنعت کے ڈائریکٹر کے طور پر ہوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پتھر پرانا پتلا لٹا ہوا مجھے ملا۔ سوادِ تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ میں نے کھولا یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو یکدم تنہا بے یار و مددگار اچھروں کے قریب مہاجرین کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغ لایا لیکن میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں کا ہر مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہونساگ شکاری بن گئے۔ انھوں نے میری جو خاطر و عزت کی ہے اس کے طفیل اب میں تپ دق کی مریض ہوں اور میرے بہت دن باقی نہیں تھوڑا پڑھی لکھی ہوں۔ یا خدا کیسے سے مل گئی تھی میں نے پڑھی مجھے یہ کہنا ہے کہ میں دلشاد بن کر بھی دلشاد نہ بن سکی۔ میں ان مجبوروں میں سے ہوں جو منہ ہی خوشی کچھڑے نہیں تکی سکتیں۔ میں نہیں لاہکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شوریٹ کا تھی۔ ان دنوں اس کی قیمت سستی اور

شانِ نریمانہ تھی۔۔۔۔۔ اسے میں نے ان جھونپڑیوں سے دور سڑک پر چھوڑا اور پوچھا پچھا آؤ جھونڈنا ایک ماٹ کی جھلی میں پہنچا وہاں ایک ویران انگھوڑوں والی جیسے کچیلے کچیلوں میں جو بس مٹی تھی۔ لڑکی کیا تھی راکھ کا ڈھیر یا چوبیسک بھرا لگا کے آگ جیسے کاروان روانہ ہوا۔

دستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک باب اس لڑکی نے ہمیں آہ بھری اور کہا شہابِ صا حب۔ میں اس سے زیادہ مٹی اور ٹھنڈی کاروں میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں میان کھسپ میں تھی اور انھی کاروں میں وہاں کیمپ پہنچ جاتی تھی۔ اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا وسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر گڑھی میں ایک نوکر کی پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چہرے پر اسی خندے ایک کاغذ کا پتہ لگا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے دنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہیں۔ ہم ان صاحب کا میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے انھیں اندھ بلیا اور کہا معاف کیجئے میں آپ کو پہچاننا نہیں۔ ان صاحب نے مسکرا کر اس برقعہ پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب اُٹھ دیا تھا۔ یہ ایک چستی رنگ کی شہرہ رخسار خاتون تھی۔ اس نے کہا میں اچھروں کی جھلی میں رہنے والی دلشاد ہوں جو دلشاد نہ بن سکی۔ یہ میرے میاں ہیں۔ اور

میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیونکہ میں پھر زندوں میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے ہاں کھانے پر آئے۔ دوسرے روز پھر دس گھنٹے باہر آئی ہیں  
میں ہجرت گئے اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

پچھلے دنوں — ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں صدر پاکستان کے ہمراہ  
مشرق وسطیٰ کے دورے کی ایک منزل دہران میں آ کر — یہاں کام کر رہے اور امریکہ کا  
ایک اہم فوجی وفد یہاں حسب رسم ہمارا تعارفی عمدہ واروں اور معززین سے  
کریا کیا۔ انہی میں ایک صاحب پاکستانی تھے، ریشمی صافہ باندھے ہوئے، انہوں نے کہا  
شہاب صاحب آپ مجھے پہچانے؟ میں نادام ہوا تو بوسے میں آپ سے کراچی میں  
ملاقات اور یہ میری بیوی ہیں۔ انہیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خاتون تھی لیکن اب پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر جوانی کے علاوہ خوشحالی  
کی آسودگی اور عافیت کا نور تھا اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔  
اس کتاب کے لکھے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ موت کے بعد  
تو نہیں البتہ اس ارضی زندگی میں آراگون کا چکر ضرور چلتا ہے۔ زندہ انسان آخری  
موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار نیا جنم لیتا ہے۔

کشتگانِ بنجرِ تسلیم را ہرزیاں از غیبِ جانے دیگرات

جب میں وصال کی زندگی کو غافلانہ تنقیدوں کے پشٹاے کے ساتھ توڑتا ہوں چھاس گئی

پر چھپیں تو مجھے ہی زندگی جاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے پھینے پر مجھ سے خوش  
ہوتے اور مجھے بہت سے طعن سننے پڑے لیکن اس روشن بشاش اور صبح چہرے  
کے مقابلے میں جرم مجھے دہراں میں نظر آیا ان کی کیا حقیقت ہے اگرچہ اس نتیجے کو بھی  
میں ضمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یارِ جانی نعمت اللہ اور اس کی سبک چڑ بیوی  
کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں میں ہفتوں داگہ کے بارہ پر کھڑا رہا۔ اور جن کی  
کی تلاش میں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوری  
حرج لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب

یکم ستمبر ۱۹۶۱ء

رَبُّ الْمَشْرِقِينَ

تو ہی دنیا میں میں محکوم و مجبور



”اُس طرف کیا ملتی ہے سالی؟ تیرا کوئی خضم ہے اُدھر؟“  
 امریکہ سنگھ نے کرپان کی نوک سے دشاؤ کی پیسوں کو گدگدایا، اور  
 بایں گال کھینچ کر اُس کا منہ کچھم سے پورب کی طرف گھما دیا۔  
 دشاؤ مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بھپن میں اس  
 کا کامیاب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک دراسی رین رین ران ران کر  
 کے وہ ماں کے سینے میں چھپاتے ہوئے دودھ سے بے کرا لمارے میں دکھی  
 ہوتی برفی ٹک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ  
 میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اس کی

یا خدا

ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر دیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اُسے اٹھائے جائیں تو وہ ارض و سماء کی دستیں پھانڈ کر اسے چھین لائے گا۔

دیم خاں جھوٹا تھا۔ مسکرائیں گا۔ آسمانوں کی بات تو دور کی بات تھی وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رو ہو بیٹھی تھی اور خیالی ہی خیال میں اپنی جبین کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دنیا پوشیدہ بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصور دلشاد کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تانباک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریکہ سنگھ کو کچھم سے بے حد چڑ تھی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چنند رواج بڑے میڑھے تھے، ایک کرے لا دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک اُن کے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو کھسبلی کے تار میں پرو کر برق دیا ہے۔

امریکہ سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن

رب المشرقین

میں ایک بیسٹھک سادا جہد پرورش پا رہا تھا۔ گھاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سریشٹام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

• سال حرامی امریکہ سنگھ کا کرتا تھا۔ مرنے کے بعد بھی ذکر ا رہا ہے۔ بھیسے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنوئیں میں۔  
• اسے چھوڑ دو بھی۔ امریکہ سنگھ کا بھائی تروک سنگھ مذاق اڑاتا تھا۔ "بانگ دے رہا ہے مٹا بانگ۔"

خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے۔ اُن  
گیانی دربار سنگھ جبرے بھانڈ کر مہنتا۔

لیکن امریکہ سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سنائے میں جب مسجد کا کنواں گھل پھاڑ کر چنگھاڑتا، تو اس کا تن بدن ٹھنڈے پینے میں شراور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مائے علی بخش کی تصویر آ جاتی، جو مسجد کے حجرے میں رہا کرتا تھا، نیمعت بدن دو ہاتھ کی لمبی داڑھی آنکھوں پر مرنے لگاں کا چشمہ سر پر سبز ممل کی ہے ڈھب سی گہڑی ہاتھوں میں رعشہ

گردن میں ابھری ہوئی رہیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کر پانچ وقت اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بنش کے نیچے وندھال لگے سے وہ زمانے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریکہ شگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر، لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے یہ بول سنا پڑتے تو وہ گھبرا جاتا۔ اس نے بڑے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اُسے سن کر بانگی جاتی ہیں اگر بن بیاہی تو خیز لڑکی بانگی جاتے تو اُس کے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہوئی بیوی بانگی جاتے تو اس کے حمل گرنے لگتے تھے، پناچہ امریکہ شگھ کے گھر میں پشتہ پشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی ادھر کسی نے کٹورے کو چھپے سے بجا نا شروع کیا۔ کسی نے چٹے کو توڑے سے لڑایا۔ کوئی لادوں میں انگلیاں ٹھونس کر میٹھ گئی کوئی بجا لے کر پھپھلی کو ٹھڑی میں جاگھنسی۔ اور اس طرح بجاؤ خاندان اپنی لادوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا

دکھاتا آیا تھا۔

امریکہ شگھ کی بیوی کے بطن میں سو لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سو لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدمی رات گئے جب مسجد کھڑا امریکہ شگھ کی بیوی کے آغوش میں بھینا نک اور ہولناک گہرے بچہ بن کر ڈکا رہا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہر بڑو بنگ چھنے لگی۔ کبھی اس کے کانوں میں گونج کی چنگاٹیں جگر خراشیں اُڈانے سے گھنچتیں۔ کبھی اس کے تصور میں گونج کا دانا جھڑ سے چھاڑ کر اس کی طرف پلکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سالکا دیتا کہ ملا علی بخش گونج کی دیوار کے ساتھ دینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم نہ دن میں گونج کی منٹ پر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "بانگ" کے دکھ دے گا۔

امریکہ شگھ کی بن کے بطن میں تو ابھی کسی خاصے نے اپنا گھر نہیں جھاپا تھا۔ گونج ابھی وہاں بیاہی تھی لیکن اس کے دل پر سو لاکھ قابضہ تھا رات کو جب وہ اپنی چاند پاتی پر میٹھ کر ان میٹھی میٹھی لہ گدڑیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اڑت میں سو لاکھوں کی بھوکی انگلیاں اُس کے



تق بدن کو چھپنی بنا کے رکھ دیتی تھیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک جہم سما اُٹا آتا اور وہ تصور ہی تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان قومی قومی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی۔ لیکن پھر مسجد دئے کنوئیں کی دلدوز چنگھاڑ اس کے ایوان تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معائنہ محسوس ہوتا کہ کنوئیں کی عمیق گہرائی سے بھی ملا علی بخش کا بے جااد کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے چیننے والی نسلوں کے نام کے بند کب رہا ہے۔

امریک شنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر غصہ آتا تھا۔ بزدل کی بھیاں  
مظاہر علی بخش ترکب سے دُور دفان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنوئیں کی منڈیر  
پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریک شنگھ نے خود اسے تیرے کی نوک پر اچھا لالا  
تروک سنگھ نے اس کو اپنی تھوار پر آزمایا، گیانی دیوار سنگھ نے اس کے  
جھنجھکتے ہوئے غن آلود جسم کو تراخ سے کنوئیں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملامتی بخش ہی پر کیا منحصر تھا۔ اب تو چکورو کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا۔ باغیں دینے اور سننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے، کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپاں سیدہ ریز ہو چکی تھیں۔ — لیکن یہ ڈر لو کہ عوام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں

کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپاتے چھپاتے پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب لبرک کی نگھ  
کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھتیاں پیٹنے لگیں تو اس کا دل عیش  
سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چٹھا اٹھا کر انھیں مار مار کر ہولناک کر دیتا۔  
مارتے مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے، بازوؤں میں تھکن آ جاتی، برگیں  
پھول جاتیں اور وہ اپنی گنجان دائرہ سے پسینے کے قطروں کو جھاڑتا  
ہوا دیوانوں کی طرح پک کر دشا دے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دائمی زکام  
کا مریض دماغ کی ریزشس کو ہلکا کرنے کے لیے دقا فوقتا سنوار سونگھ  
لیا کرتا ہے، اسی طرح گاڈن بھر کے خاصے اپنی وہم آلود بیویوں اور  
بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشار خون دھیمیا کرنے کے لیے دشا  
کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دشاد کو مسجد میں رکھ گیا تھا کیونکہ حجرے کی چھت میں جلا کر گرہ  
 چلی تھی۔ یوں تو اُس کے سرہانے میں جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اُس کا  
 عزیز ترین مرہا یہ اس کے آبا کی قیسح تھی۔ قاعلی بخش کے اتھ اسی تسلیج پر  
 گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی  
 انگلیوں کے نشان نقش فرمادی کی طرح چوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریہ

نیم شبی اور فغان سحری کے آنسو اس بیسج میں موتیوں کی طرح پر دے ہوئے تھے۔ یہی چند موتی تھے جن کے وجود سے دشا کا شاہوا صدف ابھی تک آباد تھا۔ ————— وہ دن بھر اس تسبیح کو مجھے میں ڈال کر قیض کیے بچے چھپاتے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی دیران کھنے میں دبا دیتی تھی، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سموٹی ہوئی زبانیں اس کے آبا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں! آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد وائے کنویں کی منڈیر پر پرویا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنویں میں ٹٹٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے آبا کی تیرقن چوٹی چھوڑی کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے، اس کے کان کنویں کی طرف لٹے لٹے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اس کے آبا کی آخری سسکی اُسے ایک بار پھر سنا دے یا وہ خوفناک چٹکاڑیں جنھوں نے گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی نوازیں۔ ————— لیکن کنواں تار یک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمکا ڈر اس میں پڑ پڑ پھڑپھڑاتی تو — ہر پھڑپھڑا ہٹ کے ساتھ بدبو اور تعفن کے تیز تیز جھپکے فضا میں منتشر ہو جاتے

تھے۔ کیونکہ سوا لاکھ بیادروں نے قاعلی بخش کا گلامرٹنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنویں کو غلاطیت اور کورے کرکٹ سے اثاث بھر دیا تھا۔

دشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط ٹٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ ملی ہوئی، سہمی ہوئی، گھبراتی ہوئی، حیران..... لیکن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر داں آتے تھے اور جب وہ بیادر خانے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھوتے اور دشاد کی بوٹیوں کو چھوڑ چھوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔ چمکوہر کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوئی اور بن بیاہی ماؤں کو یہ احساس تسائے لگا کہ قاعلی بخش کے بعد قاعلی بخش کی مٹی ان کی کوکھ لٹسنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ تو چمے کھا کھا کر اپنی چار پاتوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن ان کے بیادر خانے رات

رات بھر دشا دے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ۔ امریک سنگھ کا بھائی —

ایک خالص کے بعد دوسرا خالص، دوسرے خالص کے بعد تیسرا خالص

رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر، موقعہ جا چنچ جا چنچ کر

مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ تجنی ہونی بھیجی اور گردے اڑتے۔

تے ہوتے کہاؤں کا دور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی بانٹیاں بنتیں اور اپنی

نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں خود طرح

کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دیر بے مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے۔

اور ایک دن بیٹھے بٹھاتے یکایک دشا دے مسروں کی طرح پھول اٹھی۔

جب یہ خبر پھیلی تو گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ پیچ کر اپنا سر

پیٹ یا۔ کنواری رڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سنبھالیں اور مکئی کے کھیتوں

میں چھپ چھپ کر اپنے غاصوں سے سنا چھوڑ دیا۔ کنویں کی چنگھاڑیں تیز تر

ہونے لگیں۔ گھروں میں فٹ پر فٹ آنے لگے۔ چٹے پر چٹے چلنے لگے،

ایک کھرام سا چمچ لگا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دشا دے

کو مار کے کنویں میں پھینک دیا جائے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک مفید

تجویز سوچی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ

اسے اپنی بل گاڑی پر بٹھا کے پاس کے تھانہ میں لے گیا اور غواشدہ مسلمان

عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے

دشا دے کو پیش کر دیا۔

تھانیدار بھورام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراغا —

پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر مہار

سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا۔ — پھر تھانیدار صاحب

نے عینک اٹھا کر دشا دے کا جائزہ لیا۔ قبول صورت، جوان، ذرا پیلی سی، لیکن

گرم گرم، گداز — لیکن جب ان کی نظر دشا دے کے

پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی بھری ہوئی امیساؤں کو ایک زبردست دھچکا

لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو، تو وہ اسے بھی

تھانہ ہی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ نے جوڑ

توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہونے میں تین ماہ سے تین مہینے

باقی ہیں تو تھانیدار بھورام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا



کہ جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جائگہ پن کر چار پانی پر بیٹھے تو انھوں نے دشا کو پاؤں دبائے کے لیے اپنے پاس جلیا۔ جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ تعانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آگیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر، پھر کولہوں کے آس پاس —

اور وہ دشا دکھ لگتا۔ کچر کر اپنی دکھتی ہوئی رگوں کا درد دہلاتے رہے۔ تعانیدار بصورام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ چاہا ہوا تو کیا، چنیں ہوا تو کیا؟

دشا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کچھلے چمکدھمکیوں میں اس نے زندگی کے پیچ کچھ اس طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن کر رہ گئی تھی۔ جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا رہا رہتا اور اس کے جسم کا ہر حصہ بھرکتے ہوئے، لپٹتے ہوئے، بے چین انسانوں کو چمکدھمکیوں میں تسکین کا جام پی دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی رگ رگ میں کتنے پھوڑے تھے، کتنی ٹیسیں تھیں، کتنے رستے جوئے زخم تھے، کاشش! رحیم خاں بوتا تو دیکھتا۔

دشا کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بچپن سے رحیم خاں

کو اتنی بار مانتی، یاکس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دشا نے غصہ سے اس کے سر پر ایسا دو تھپڑ مارا تھا کہ اس کی چوڑیاں فوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گر گئی تھیں اور وہ خود ساری رات انگاروں پر بونتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسول رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بچپن سے رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تعانیدار بصورام کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد خراب ہوا تو انھوں نے دشا کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹبل دریو دھن سنگھ کے ساتھ اسے انبالہ کیپ بھیج دیا گیا۔ راستہ میں ہیڈ کانسٹبل دریو دھن سنگھ کے کمرہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اٹھا۔ لیکن دشا دہری مند ہی سے اس کے درد کا مدا کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انھوں نے دس بارہ دنوں میں بخیر دعا قیمت طے کر لی۔

انبالہ کیپ میں بہت سی رکیں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان بھی، خوبصورت بھی، لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح، کم جن کے شراب کچھ لگے ہوں جن کی ککشاں لٹ گئی ہو، جن کی نوپروں پر کچھ لٹ دیا گیا ہو۔ ہر روز فرج کے ٹرک آتے تھے درائی نئی موٹیکوں، نئی نئی ٹورنوں

انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی جینج کے یہ بچھرے  
ہوئے انول موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی اُن  
پر اپنے "سبحان" اپنے "عقود الرحیم" اپنے "پاک پروردگار" اپنے "قادر  
مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کا نڈر میجر پریم سنگھ  
اور اس کے جوان دوست سپاہی ابھی تک ان پر گرد کی بانی جیتے تھے۔ خیر  
دشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ  
کا سہارا ہوتی ہے لیکن دشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسہ  
تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی محسوس ہواں کو اپنی حفاظت  
میں سے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سورج کی روشنی میں  
ریل کی پٹریاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دُور بہت دور مغرب  
کی طرف ان کی لقرتی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی  
تھیں۔ ان جزیروں کے کہیں آس پاس دوزخ کی سرحد جنت کی سرحد سے  
مٹتی تھی اور کیمپ کی عورتیں ریل کی پٹریوں کو چھو چھو کر سرشار ہو جاتی تھیں  
کہ ان کا دوسرا سر مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے! مغربی پنجاب!!

مغرب کا خیال آتے ہی دشاد کی راکھ میں ایک ننھا سا چراغ ٹمٹما اٹھتا۔  
مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کیمپ کی  
دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے  
بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزت ہے۔  
وہاں آرام ہے۔ ————— دشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم خان  
بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا رواں رواں چل اٹھتا اور وہ بے  
چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھکے ہوئے، ڈکھے ہوئے جسم  
پر اس ارض مقدس کی خاک ملے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے ————— دن گزرتے گئے۔  
راتیں بیتی گئیں اور مغرب کا خوش آنند تصور دشاد کے سینے میں  
امیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجر  
پریم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دن وہ  
ریل بھی آگئی جس کے انتہار میں امیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے  
جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی تو دشاد کو قلعہ علی بخش کی یاد آئی وہ بھی  
اسی طرح ریل میں بیٹھ کر چل کر روانہ ہوا تھا گئے ہیں ہمارے، کپڑوں پر عطر تھا اور



گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہوتے اس کے ساتھ اسٹیشن تک آتے تھے۔

!

ریل کے ہر فرارٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے آگینے جھنجھنا اٹھتے تھے۔ پہنیوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔ جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کرتا رہے کھجیوں کو دلچسپی جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے تو انہیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چہرہ چہرہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انہیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکتی تو ہماری کائنات دم مادمہ لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انہیں یہ ڈونگتا کہ شاید انہیں کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آگئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں، سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھونے کی کوشش کرتیں جو مغرب کی سمت سے آرہی تھی !

لدھیانہ، پھلور، جالندھر — امرتسر — ہر

منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھتے گئے۔ ان کی خاک میں سوتے ہوئے نفیے بیدار ہونے لگے۔ وہ گھٹانے لگیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ وہ آنکھیں مل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی نے بالوں میں کسنگھی کی۔ کسی نے دوپٹے کے ساتھ دانتوں کی میل اٹا دی۔ کوئی کپڑے بھارنے لگی۔ کوئی بچوں کو لوریاں سناتے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سر بوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے دس بھرے، دیر باگیت، کہ "اے کالی کالی دلے میں تیری شرب نمری ہیں آئی ہوں"۔ مجھے اپنی گل میں چھپا لے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنائے۔

جب گاڑی امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بس ڈیڑھ گھنٹہ اور ! ساتھ اور تین نوے منٹ ! یہ ناقابل یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پا کر وہ شدت احساس سے مفلوج سی ہو گئیں۔ پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر ان کے سینے میں عود کر آئی۔ ماضی کی ہونا کی حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانوں پر غالب آگئی

یا خدا

ایک ایک اُن کو اپنے شاداب لائوں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھائی  
اپنے نحیف نحیف ماں باپ، جن کے بے گور و گفن لاشے گھریوں میں پڑے  
سڑ رہے تھے۔ اپنی اداکس اداکس بنیں جو کیمپوں میں میٹھی فرشتوں کا  
انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انہیں اپنے فوری پروں میں چھپا کر لے جائیں۔  
دُور کہیں بہت دُور مغرب کی طرف ————— وہ  
رہنے لگیں۔ اُن کے گالوں پر آنسوؤں کے پرناے بننے لگے۔ و بشار  
بھی رو رہی تھی، ہلک کر سبک سبک کر اور آنسوؤں کا ٹھیک  
پانی اس کے ہونٹوں پر پاڑی چشموں کی طرح اُبل رہا تھا۔ وہ روتی گئی،  
وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی ہلکوں کو اپنے دامن میں  
چھپا لیا۔ ایک عجیب سی خود گئی، ایک عجیب سا شمار اس کے رویں رویں  
پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں  
غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار مینویں اُس کے تن بدن پر رنگ رہے  
ہیں۔ رنگ رہے ہیں!!

رَبُّ الْمَغْرِبِینِ

مری دنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک  
 مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دشا د کے پلو میں ایک  
 ننھی سی بچی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نما رہی تھی  
 درختوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے  
 تھے، اسٹیشن پر چل چل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگاتے  
 دودھ اُبال رہا تھا۔

دشا د اٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقابہت سے  
 چائے والے سے پوچھا: کیا یہ مغرب ہے بھائی؟

چائے والا اپنے پیلے پیلے کر یہ افطر دانست نکال کر ہنسا " کیوں؟  
کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی  
منت کے صلے میں دشا دے سے ایک چوٹی مانگی۔ پھر یاس ہو کر اس نے  
دشا کو چند فیض لگایا دیں۔ "سارا ڈبہ پلید کر دیا رائڈ نے" ذرا صبر نہ  
ہو سکا؟ راستے ہی میں جن بیٹھی۔ "اسٹیشن کی مہترانی  
جا کر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر  
دشا کو ڈبے سے نکال دیا۔

پیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹیلیا کھڑا تھا۔ دشا دے اس  
کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا شال تھا۔ تانبے کے چمکدار  
سکاواری سے ابلتے ہوئے چلتے کے بھلے پیچ در پیچ نکل رہے تھے جیسے  
کسی نازنین کے گیسو ہوا کے دوش پر نہا رہے ہوں۔ اس کے آگے بھلون  
کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کافدوں پر کندن کی طرح دکھتے ہوئے کیلے  
شکرے اور مانے بھانے رکھے تھے۔ ایک لٹا ہوا سرخ انار چھا بڑی  
میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوڑوں کے بڑے بڑے خوشے ٹک رہے تھے

دشا دے کا کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اس کی زبان پر گدے گدے 'میلے میلے  
عاب کی پڑیاں جی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سنگ  
رہا تھا۔ اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اس کا سارا بدن  
ایک دُکھتے ہوئے پھوٹے کی طرح چمڑ کر رہا تھا۔

دشا دے نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی نخی سی بچی  
چوہیا کی طرح اس کے سینے سے چھٹی ہوئی جس جس دودھ پی رہی تھی۔  
کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوئی ہی رہی اور مغرب کی سہانی  
منزل مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سٹیشن  
کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اس کا رحیم خاں اس کے انتقال میں کھڑا  
ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جھگڑوں میں کھویا ہوا اسے تلاش کر رہا ہو  
جو پیٹ فارم پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی، کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جائے  
لیکن اس کے گھٹنے کاٹک سے بچ کر رہ گئے۔ اس کی پنڈیوں میں رعشہ  
سا آ گیا اور وہ سر تعام کر ٹھیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش خوش شکل جوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیے پیٹ فارم



پرٹل رہے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس مگلا تھا جب وہ دشا کے سامنے سے گزرتے تو دُور تک پیچھے مڑ مڑ کر اُسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چہرے کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دشا کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دشا کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ ہم درجا کا ایک عجیب سا ٹانا بنا اُس کے دماغ پر چھایا۔

چمکورد کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحہ اسے گھورنے والے کے ہاتھ اُس کا گوشت نوچ کھسٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن رین میں بیٹھ جلنے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا کھو بیٹھا تھا جو مغرب کے تصور سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہوئی تھیں اس لیے وہ سوچنے لگی کہ شاید یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں جن کے خون کی کشش انہماک کیپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دشا کے دل میں خوشی کی ایک سرسبی ناچی۔ وہ تو مسکراتا بھی پاتا ہی تھی۔ لیکن اُس کے بدن میں درد کی میسوں کا طوفان سا اٹھا ہوا تھا اس لیے وہ باوجود کوشش کے ہادئی طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت

کا جتنا پوچ اس کا دلکتا ہوا۔ رستا ہوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا اس نے اپنی آنکھوں میں سیٹ کر اُن فوجیوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔  
 "انور!" ایک فوجی ان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر چھوڑ کر گر بخوشی سے مسکرایا۔

"رشید" دوسرے فوجی نے گر بخوشی کا جواب گر بخوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دشا گویا سرشار ہو گئی۔ یہ دو نام اس کے کانوں میں آبِ حیات سا ٹپکا گئے۔ مینوں سے وہ ایسے دھوس نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے گانوں کے انور رشید، محمود، نسیم، خالد، جادی، توہمت سے مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے تصور میں اب شمشیر، سنگھ، امریک سنگھ، کرتار سنگھ، تریلوک سنگھ، پنجاب سنگھ، سور مکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اُڑدھوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہر اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑاند اس کے رویں رویں میں بسی ہوئی تھی۔ اُن کا وحشی اُبال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر بچا ہوا تھا لیکن اب جو اس کے کانوں نے رشید اور انور کے نام سُنے تو اُسے

یا خدا

یوں محسوس ہوا جیسے وہ آب کو ٹر سے نسا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفا  
پانی اُس کے گئے ہوئے 'سڑے ہوئے' جسم پر لکھاب اور کافور کی خوشبو میں  
چھڑک رہا ہو۔ ————— اس کی گری ہوئی گردن میں افتخار  
کا اُبھار آگیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ سینے میں امید و مسرت کی کرنیں  
پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن دو جوانوں کو اپنے  
قریب بلایا۔

• یہ کیا جگہ ہے بھائی؟ " دُشاد نے پوچھا۔

• لاہور ہے۔ " انور نے کہا۔

• تم کہاں جاؤ گی؟ رشید نے پوچھا۔

• جہاں قسمت لے جائے۔

• باپ رے باپ! " انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

• بڑی سپورٹ ہے بھائی! " رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

• "آؤ بہن" تم ہمارے ساتھ چلو۔ " دونوں ہنر زبان ہو کر بولے۔

جب دُشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی  
بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

رب المغربین

• ارے " انور حیرانی سے اُچھلا۔

• یہ کیا جگہ ہے؟ " رشید نے پوچھا۔

• لڑکی ہے جی۔ " دُشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی۔

• بڑی چھوٹی سی ہے۔ " انور نے جائزہ لیا۔

• ایک ہی دن کی ہے جی۔ " دُشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا

نہ کہے۔

• آخ تھو " انور کو اُبلائی سی آئی۔

• لا حول ولا قوۃ " رشید کا جی متلایا

وہ دونوں بھائی تھے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم دُاں سے

چلے گئے۔ سامنے ولبے پیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھرلیلی

سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈول

شافوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے پھلانگیں مار کر ریل کی پڑھی

کو عبور کیا اور اُتھوں میں ہاتھ دیے اس خوبصورت عورت کے تعاقب

میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت شیٹن کی رونق ذرا دُھل گئی۔ دھوپ میں تمازت

یا خدا

کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دشاؤ کے دکھتے ہوئے جسم کی  
مکھور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پیٹ نارم پر دھوپ بینک رہا تھا  
ان کا چھوٹا سا لڑکا دشاؤ کے قریب اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ جب  
اس نے دشاؤ کی نفی سی لڑکی کو دھوپ میں بیٹے ہوئے اپنے چھوٹے  
چھوٹے ہاتھ پاؤں مارستے دیکھا، تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے  
پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیخا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے  
کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

”اؤ ڈنڈر فل، ممتی، اؤ ڈنڈر فل! بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور  
مسترت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دشاؤ کی بیٹی ایک چھٹی سی چادر میں پٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے ٹھونٹے  
تار کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض سما  
کی کوئین کو اپنی ٹھوکرؤں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس نفی  
سی چیز کو دیکھ دیکھ کر آیاں بہاتا تھا، ناپتا تھا اور ہر لمحہ کوشش کرتا تھا  
کہ وہ اچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالے۔ اُس

رب الخوفین

اس کی ماں نے اُسے دانٹا کر دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔  
لڑکا چل گیا۔

”ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے؟ لڑکے کے باپ نے اُسے  
چمکارا۔

”بھوٹ“ لڑکا دور رہا تھا۔

”ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لادیں گے؟ لڑکے  
کی ماں نے وعدہ کیا۔

”تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لادو گے؟“ لڑکا بات پکی کرنا  
چاہتا تھا۔

”بہت جلد میرے بیٹے بہت جلد۔“ باپ نے اپنی بیوی کے گڈن کا  
جائزہ دیا۔ جس کی گولائی پریٹ کے اوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے  
شرما کر منہ پھیر لیا۔

”ممتی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!“

”نہیں بیٹے، یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔“

”اچھا تو ممتی، اسے ایک عمدہ ماسوٹ دو۔“



یا خدا

”ہاں میرے ڈارنگ! ہم اسے کپڑا دیں گے۔“

”اور پیسے بھی، میری ممتی!“

”ہاں، پیسے بھی میرے ڈارنگ۔“

رڈ کا خوشی سے چنج چنج کر پھرتا یاں بجانے لگا اور جب اس کا  
 بی اس کیل سے بھر گیا تو اس کی ماں نے دشا د کو ادنی کپڑے کا ایک  
 ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جلنے لگے، تو دشا د نے دل  
 ہی دل میں اس بچہ کو دعا دی، جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا  
 فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دشا د کے ہاتھ میں پیسے آگئے، تو دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ  
 از سر نو قائم ہو گیا۔ ایک چلتے ولے نے اس کے پاس آکر گرم چائے  
 کی ٹانگ لگائی۔ ایک ”گوشت روٹی“ والا بھی اس کے نزدیک اپنا  
 خواجہ لے آیا۔ اور جب دشا د روٹی کھانے لگی تو ایک کتابھی زبان کمال  
 اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بچہ پر دو بزرگ بیٹھے رائے نہنی فرما رہے تھے۔  
 ایک کی دائرہ سی سفید تھی، دوسرے کی خانی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز

رب المخرمین

اس کی میم اور بچے کی حرکات پر ناک بھونچ رہا ہے تھے جب میم نے  
 دشا د کو ادنی کپڑا اور پانچ روپے خیرات دیے، تو ان دونوں بزرگوں  
 کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگ نے ان کی دائرہ سیوں کو کپڑا کر زور سے  
 جھٹک دیا تھا۔

”لا حول ولا قوۃ“ ایک حضرت خفا ہوتے۔ ”یہ حرامی اب تک بھتے  
 ہیں کہ ہم انھیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔“

”اسے میاں قصور ان کا نہیں۔ دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔  
 کیوں نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟  
 اللہ اللہ آزادی تو ملی، لیکن قلامی کا چکانہ گیا۔“

”جاتے کیسے میرے بھائی، جاتے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی  
 جوتیوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار  
 کون اٹھائے؟“

”اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی۔ جس رزق سے آتی  
 ہو پروا نہ میں کو تا ہی۔“ پہلے بزرگ نے رقت سے الٹا پا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے



یا غفلت

ارشاد فرمائے جب دشا و چار آنے کے گوشت تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخ شکم کو اندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اس کے پاس آئے۔

”اے عورت کیا تم مہاجر ہو۔ ایک نے تنگیں انداز سے پوچھا جیسے زمانہ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کرتا ہو۔

”جی نہیں میرا نام دشا دہ ہے۔“

”اے ہوگا لا حول ولا قوۃ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو۔“

کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کیا کام ہے؟ دوسرے حضرت نے مہارانی کی۔

اے لاش دشا کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزل مقصود کا نشان —

کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تخیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی جس میں

اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ اینٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمہاری جیب میں پیسے ہیں؟

تمہارے جسم میں تازگی ہے؟ —

”تم مہاجر ہو۔ ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔“ تم مہاجر خانے چلی جاؤ۔“

رب المغربین

”آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پتیں ہاں۔“

”تم کوئی بچہ نہیں ہو۔ تمہیں خود شرم آنی چاہیے۔“

دشا دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی لڑکا کہیں ہرزہ گرد کے گھر سے بھاگ گئی تھی لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اسے ہی پکارا اور سب نے اسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ ————— مہاجر خانہ کے دربن پر۔ ایک دفعہ جب

دشا اپنے آبا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں مہاجر خانے کے مہاجر خانے میں

ٹھہرے تھے ————— مہاجر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں

ایک بھبیان ادبوں کی آگ پر ماکش کی دال اور چائیاں پکا رہی تھی جب

دشا اس کے پاس چائی پر کھانا کھانے بیٹھی تو بی بھبیان نے بہت سا

گھی پایز کے ساتھ گجھار کر اس کی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پر تازہ

مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب قاضی بخش عشا کی نماز پڑھنے

لگا تو بھبیان دشا کی چار پائی کے ساتھ اپنی چار پائی لگا کے لیٹ

گئی اور دیر تک اسے مزیدار کمانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ کا قصہ، کبھی پروں کی بادشاہ زاد کی کہانی، کبھی اپنے بھتیجے کی جبرین کہانی بھٹیاردن کئی دفعہ روتی، کئی دفعہ ہنسی۔ اور آج تک جب دشا دشا شہر کی بارش سڑکوں کا تخیل باندھتی، تو اس کے پردہ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا طقس ابھرتا اور اس بھٹیاردن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی، اور کبھی دشا کو گرم گرم چپاتیوں پر لکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی مہاجر خانہ ————— شاید مسافر خانہ کا بڑا ہوا نام ہو جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں۔ ————— لیکن اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے جہلا، دشا تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ علامتی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے نال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم حسنا کا افسانہ محبت بھی منقوس تھا۔ وہ دشا کے ساتھ آباد، بیداد، جیسا د کے کافیئے باندھ کر بڑے ریس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ ————— جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے ستانوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایکس پھولدار می میں رجسٹر گھوسٹ بیچا تھا، کچھ دیر کے بعد دشا کی بادی آئی نام؟ افسر نے طرح کی طرح رہا ہوا حوالے دہرایا۔

”عمر؟“

”بیس سال۔“

”باپ کا نام؟“

”علامتی بخش۔“

”زندہ ہے یا مر گیا؟“

”مار ڈالا گیا۔“

”گاؤں؟“

”چمکوتہ۔“

”ضلع؟“

”آباد۔“

’شادی شدہ؟‘

’جی نہیں‘

مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور خشکیوں سے دھاوا کو گھورا۔ ’پہلڑی کی کس کی ہے؟‘

’جی پہلڑی میری ہے۔ دھاوا کھانے لگی۔ میری شادی ہو گئی ہے جی‘ میں بھول گئی جی۔‘

افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا۔

’سوچ کے بولنا۔ دکان کا نام؟‘

’رجیم خان‘

’زندہ ہے یا مر گیا؟‘

’جی..... پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اسے لگ جائے جی.....‘

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا پانچ سو فٹ چوڑا۔ ایک کھلمیدان۔ جس کے چاروں طرف کاتوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لئے آسمان کالاجوڑی سانبان تھا روشنی کے لئے ماہتاب کی قدیل اور تاروں کے لمحاتے ہوئے چراغ تھے۔ ایک

کوٹے میں باورچی خانہ تھا۔ زمین میں کھودے ہوئے عمیق پتلیوں پر وال بورگوشت کی بڑی بڑی پکلیں پک رہی تھیں۔ رات کے

اندھیرے میں پتلیوں کی آگ دگیوں کے گرد اگر دیوں بھڑکتی تھی جیسے پتلیوں کے شعلوں میں دیوتاؤں کے لاشے جل رہے ہوں۔ آگ

کی روشنی میں مہاجر خانے کا وسیع میدان گھبراٹا تھا جس طرح شفق شام میں نقرے ہوئے امیر پاروں کی سرخی کسی قبرستان پر فبار کی طرح چھا

جائے۔ ساری فضا میں ایک غمناک سا بھراؤ تھا۔ ایک ہاکا سا ایک غیر محسوس سارا تعاش جس میں لاکھوں سینوں کے کچلے ہوئے ارمائوں

اور ٹوٹے ہوئے دلوں کی مصوم ہر کنکریں کچکپکاری تھیں۔ تھر تھری تھیں اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون و جود کا یہ مصنوعی عظیم یکا یک ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک زبردست طوفان ایک بے پناہ زلزلہ ایک ہولناک جنگل ساز زمین و آسمان کے نظام کو ہر ہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

واٹا واپنی بچی کو سینے سے لگائے قدم چھوٹک چھوٹک کر چلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بیجا بیجا کرباؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس مزار کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کچھ مہاجرین نے ہانسون پر چادریں تان تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنائی ہیں کچھ مہاجرین کچھ قبروں کی طرح یوں ہی آسمان تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان تیری لہر پر شہنشاہ فشاہی کرے۔ کسی کے پاس چادر تھی کسی کے پاس مکمل کسی کے پاس لحاف واٹا وکے پاس نہ چادر تھی نہ مکمل تھا نہ لحاف۔ وہ خود ایک جوتھڑا تھی۔ ایک بوسیدہ سا ایک فرسودہ سا کھڑا اجڑا مکھڑا لباس وہ شیزگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا۔ مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں جوتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ سب کچھ دل میں امید کی لوگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی پیاری سر زمین پر آگئے ہیں۔ اب اس ارض مقدس کی خاک انکے گتے ہوئے ہاتھوں پر مہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کا تبرک پانی انکے رستے ہوئے زخموں کو دھو ڈالے گا۔ اب یہاں کے سورج اور چاند کی خمیریں انکے چاک و امون کو روٹ کر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ کی طرف اشارہ کر گئی۔ کچھ دور آگے ایک بڑے سہل ضعیف آدمی ڈبہ ڈالے بیٹھا تھا۔ انکے ساتھ دو بچے تھے ایک آٹھ دس سال کا لڑکا محمود ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی زبیدہ وہ تینوں ایک مٹی کے پیالے پر جھکے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سان میں بوٹی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرتی تھی اور کہتی تھی کہ جردہ گوشت نہیں کھایا کرتے اس سے ہیٹ خراب ہو جاتا ہے۔

دانتوں کو کیزا لگ جاتا ہے۔ لیکن محمود بچل رہا تھا۔ دادا اسے چکارتا تھا۔ زبیدہ اسے ڈانٹتی تھی۔ کیا میں تجھے اپنی بوٹیاں کاٹ کر دوں۔ وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھائی کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو مھوس ہوتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا نمبر بھان داؤ نہیں زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شعور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک مضمی سی بہن ایک مضمی سی بیٹی ایک مضمی سی ماں کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

”نہیں بیٹھ جاؤ بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟“ بوڑھے دادا نے واٹا دے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میرے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔“

”جاؤ روٹی لے آؤ یا ورنہ جی ماناں سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟“

”جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔“



یا خدا

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اُسے دے دیا۔  
 ”پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟“  
 ”جی نہیں، میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔“

دادا نے اس دیرانی بستی پر ہمدردی کی ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی  
 بالکل اسی حالت میں یاں آیا تھا۔

”باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کبیل مانگ لینا وہاں سے۔“  
 پھر دادا نے ساروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ ”نوبت رہے میں شاید  
 سٹور باجو جاگتا ہوں۔“

باورچی نے دشا کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر وال دے دی۔ کپڑوں  
 کے دفتر میں ایک مدہم سی لائین جل رہی تھی۔ خیمے میں رفعتیوں کے انبار  
 لٹے ہوئے تھے۔ ”سرخ سرخ“ ”بھورے بھورے“ کالے کالے کپلوں کی تھوں  
 پر تھیں جی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ ادنی سوٹر  
 پٹو کے کوٹ، گرم چادریں — سٹور باجو سرخ و سفید چھینٹ کی خالی  
 اوڑھے چادر پائی پر لٹا ہوا اقبال کا شکوہ گار تھا۔

رختیں میں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو چپائے مسلمانوں پر

رب المیزین

جب اس نے دشا کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اس کے  
 ترنم کی لے سست پڑ گئی اور اس نے نہایت خشکیں انداز سے دشا کو گھورا۔  
 ”دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بجے آنا۔“

”تمہارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پالے سے مر جاتیں گے۔“  
 ”کوئی نہیں مرتے۔ صبح آٹھ بجے آنا، ان۔ دفتر بند ہے اس وقت۔“  
 دشا نے ایک بار پھر اتھار کی۔ سٹور باجو جھنڈا لیا۔

”میں کتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح۔ میں بھی آخر انسان ہوں مٹیں نہیں  
 ہوں، ان صبح آٹھ بجے آنا۔ اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکڑ کر  
 شکوہ گانے لگا — آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر  
 اب انھیں ڈھونڈ چرائی رُخ زیبا لے کر۔“

جوں جوں رات بھگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ  
 یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہوا کے  
 جھونکے تیر و نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں  
 کی طرح جسم میں چھبتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کبیل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے  
 بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کبیل اُن کے اوپر ڈال دیا تھا۔

وہ خود ایک تپتی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہوا کر دیش بدل رہا تھا۔ وٹا دیکے  
وانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو، کوئی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے  
سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ دیرت جاتی تھی۔ کبھی اٹھ بیٹھتی تھی۔ کہیں  
کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ، ہر سلو سر دی کا اثر سانپ کے  
نہ ہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسراتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ  
شاید اگلے لمحے وہ برت کے کمرے کی طرح جم کر گر جاتے گی۔

کچھ دور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقے سے اپنی  
چادر سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس  
بھی نہ کپڑے تھے۔ نہ لحاف نہ چادر۔ لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس کے  
سینے میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جیسے بہت دور، افقی لکیر سے پرے  
اومڑوں کا ایک کارواں کسی جنت کم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو، چلا جا رہا ہو  
رواں رواں رواں دواں..... جیسے جیسے سروی بڑھتی گئی، لڑکی  
کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناؤ آگیا  
جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تعام کر آپس میں  
رسم کشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی۔ بے بس ہو گئی، لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش  
کا جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے  
لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت  
سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوڑوں کی طرح ذر ذر دیکھا۔ نگاہوں سے ادھر ادھر کی  
ادھمکے ہوئے جھمکے ہوئے، شرفٹے شرفٹے اگلے اپنے کپڑے کھیل کر اپنی ٹھنڈی  
ہوئی تباہ بچی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بچی سی لہرائی اور اس جوان  
عورت کا برہنہ جسم کائنات کے درے درے کو دکھانے لگا کہ دیکھو دیکھو لا جواب  
ساعت بیت نہ جاتے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔  
لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں میں اس کی  
موتی بیٹی لپیٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑا ہوا دوسو میں گرم کپڑے اور لحافوں  
کے ڈھیر ہوں۔ اور سو رہا بوزخانی میں لپٹا ہوا "مشکوہ" گا رہا ہو اور —  
عورت کا عواں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات  
کی غفلت میں رو سیاہی کی کالک اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جوتار سے  
ٹھٹھارے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے  
لحافوں کے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹنا



یا خدا

جو آسمان پر بے پردائی سے بھری ہوئی تھی، سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پٹلیوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ — ٹپ ٹپ ٹپ — بوندیں برس رہی تھیں ٹھنھری ہوئی ہوا کی نین سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھی۔ مہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی، کچھ بچے رہنے کچھ عورتوں نے شور مچایا، کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھایا۔

میدان کی بوندیں دشا دے کے بدن میں بند دق کے پھرتوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریکہ سنگھ، تروک سنگھ، سور مکھ سنگھ، دھار سنگھ کی کرپا میں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی غلالین کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوذ کرتا گیا اور اس میں پٹی ہوئی نخی سی جان سردی سے پکپکانے لگی۔ دشا دے سوچا کہ اگر وہ دادا سے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کبل میں ڈال دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا، وہ اپنی میل سی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ دشا دے اُسے شانوں سے ہلایا، بانوں سے ہلایا، گردن سے جھنجھوڑا، اتھکھینچے، لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس

رب العزیز

سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں ہم کے رک گیا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پوچھی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرد میں جھستہ چاندی کی طرح جھلایا یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرقی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چھٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کار نے مرمز کو تراش کر یہ خوبصورت بت بنائے ہیں۔ عورت کے کئے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جھلکا رہے تھے۔ اس کی گھنٹی زلفیں کاسے ناگوں کی طرح بھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جی ہوئی تھی جیسے اُس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی مہند ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ مسٹر کمبلوں کا پنڈا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کبل انھوں نے دادا پر ڈال دیا۔ ددرا عورت کے گھٹے بدن پر، تیسرا اس کی بچی پر چڑھا۔ اور اسی طرح وہ میدان میں بھری ہوئے لاشوں پر نیم گرم گرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف

دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصور میں ایک ان دیکھی ان جانی  
ان بھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا تو وہ سب بے فائدہ عبت ہیں مگر جانتے تاکہ ماجر خانے کے  
مستران پر بھی اونی کھل دلتے جائیں اور ان کے پکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھنڈی  
ہوتی پٹیوں کو ذرا سا سکون ذرا سا گرمی ذرا سا آرام میسر آئے۔

محمود چل رہا تھا کہ داد کو وہ ٹوٹ اٹھا کہ کہاں سے گئے؟ زبیدہ نے  
سمجھا ہی تھی کہ دادا ابا اور امی کو جٹ گئے ہیں۔ وہ کب آئیں گے؟  
وہ بہت جلد آجائیں گے، میرے محمود وہ تو برس اتنے ہی جو آگے۔ ابا اور  
امی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اندھ میاں سے ٹٹے گئے ہیں  
وہ اس کے دربار سے تھارے لیے عہدہ عہدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا  
ٹوٹا، بڑی گیند، چابی والی موٹر، نئے بوتلے دار ٹوپی۔ محمود  
کا تخیل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھر  
کر آئے تھے امی تھی اور جب کبھی محمود اور دادا ہر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر  
بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال دیتی تھی۔

ماجر خانے کی مشین بائیس کوپ کی طرح چل رہی تھی صبح سے شام تک  
اس کے پردے پر جھانک جھانک کے سین آتے تھے اور نکلی جاتے تھے۔

بازیرچہ اطفال ہے دینا مرے آگے ہوتا ہے شب بزمنا مرے آگے  
بڑے بڑے دہدہ دلتے رتیں اور نواب آتے تھے اونچی اونچی کرسیوں  
دلے حکام آتے تھے سرسرتے ہوئے ریشم و کھواب میں لبوس کلیوں کی طرح  
کھٹے ہوئے حسن میں سرشار حجاب اور پینلی کے عطر میں مکی ہوئی بگمات تکی تھیں  
وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کمرے  
ہو کر ان کی اشک شونی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی میوٹھونک کو  
ان کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکدار موڑیں انھیں ماجر خانہ  
سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لانا تھا، کوئی کپڑے بانٹنا تھا، کوئی  
پلاؤ اور تورے کی دیگیں تقسیم کرنا تھا اور جب کوئی اس کا ذخیرہ میں رہے  
چرٹھ کے حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مسرت کی سرفخی پھیل جاتی اور وہ  
دل جی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت  
کا وہ سے ایسے سامان پیدا کر دیے جن کے فیصل اس ناچیز کو بھی مقدور بھیج  
خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ دشا و سوچتی تھی کہ جب کوئی  
جوان مرد محمود اور زبیدہ کا قصہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر گولی  
سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کڑا کے کی مردکی میں بھی دادا کو صرف ایک



ہی کہل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی ربد بے دلے، فٹنے والے بند اقبال  
لوگ اس کی اپنی رام کمانی نہیں لے تو ان کا خون کھول اٹھے گا۔ ان کی عزت کو  
شدید چوٹ ملے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر ایک سنگھ ترلوک سنگھ  
کرتار سنگھ دربار سنگھ کی غاش میں چل نکلیں گے۔ — لیکن سننے والے سنتے  
گئے، منہ لے لے ساتے گئے۔ دن میں مٹھائی اور پلاؤ جٹا گیا رات کو رستائی  
ہوا کی شمیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائیسکوپ بستر چٹا گیا، ایک  
سین کے بعد دوسرا سین، دوسرے سین کے بعد تیسرا سین — نہ آغاز  
نہ انجام، ایک مسلسل اور پیچیدہ نظام ترجمہ کہ جس میں انسان انسان کا راز نق  
بننے کے لیے بے قرار ہو، بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر  
سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا دھوکہ دہا کرے پچھلے پرتلا ہوا ہو۔

ایک صاحب برائے غیر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ، سر پر ترچی ٹوپی  
آنکھوں پر سونے کے فریم والی سبز ٹینک، اچھے دانتوں میں سنہری کیلیں منہ میں  
پائپ، انگلیوں میں من اور یا قوت کی بیش بہا انگوٹھیاں — وہ گھنٹوں  
مہاجر خانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے  
تھے کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چاکلیٹ — وٹا دیر بھی ان کی خاص

نظر عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بھی کے لیے سرخ ادن کا وعدہ زیب سوٹر  
لائے۔ دوسرے روز انھوں نے رستم خان کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ  
دنوں کے بعد وہ وٹا دیر کے لیے ایک ہانقر اعیانہ کا پیغام لے کر آئے کہ رستم خان  
کا پتہ مل گیا ہے۔ بھاریا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور لیکن وٹا دیر  
کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک باہر زیمیت اٹھائے بیٹھا ہے۔ وٹا دیر نے رستم خان  
دنیا گھر ہو گئی۔ مہاجر خانہ کی زمین پر پھول ہی پھول اُگ آئے۔ اس کے  
بدن میں سگنے والا نہر کا نور کی طرح شکشا ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے  
سینے میں اراٹوں کا بے پناہ جھوم چھپاتے مشر مصطفیٰ خاں سیال کی موت میں آ  
بیٹھی۔ کارفرمائے بھرتی جابری تھی۔ لاہور کی مڑکیں زمین سانپوں کی عزت مرالہ  
کر گز رہی تھیں۔ یہ بارخ جناح ہے، یہ گلستانِ فاطمہ کی چادر دیواری ہے۔ یہ مکہ  
منظر کا بت ہے۔ یہ مال روٹ کے زمین سیٹوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک  
ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے، وہ مسجد ہے۔ .... یہ  
مصطفیٰ خاں میاں کا ملکوت ہنگامہ ہے۔ نوکر دوں کے کمرے میں گڑ مٹھوں بک رہا  
ہے۔ آج کرے جی بھر کے سنگار تو ہے جانا ہے۔ آج کرے جی بھر کے سنگار  
وٹا دیر کا دل دھک دھک بچ رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک

انوکھے سرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی ہوا میں اس کی دلاویز سانس بسی ہوئی ہو۔ دشا کی نظر عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ کھد اور دینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر سجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے۔ ایک نوکر نے اسے ایک پیٹ میں پلاؤ۔ ایک میں پاک اور گوشت، ایک میں مٹر اور تھیر، ایک میں کیوڑے میں لگائی ہوئی فرنی لاکر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی۔

— وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی مدح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے مرا پا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتے چوڑے رجبے تھے۔ مصطفیٰ خاں سیما کی ڈریسنگ گاہ پہنچنے اس کے سامنے بھوکے گدھ کی طرح مستلار تھا۔ میز پر سکاپ و سکی کی بوتلی جگمگ رہی تھی۔ وہ اپنی ہانھیں پھیلا پھیلا کر کھٹکتا تھا کہ میری جان! آکر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی منظم ہو۔ تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک میر انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خاں معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی دیرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی سستی

کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ! میری جان! آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ اب تم اپنے آزاد وطن میں آگئی ہو۔ اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ جاؤ وطن ہے۔ یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!

— دشا کے گلے میں قاعلی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی۔ جب مصطفیٰ خاں سیما کی زبان پاک پلک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دشا کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے۔

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خاں سیما نے اپنے جج کے اراکان پوسے کر دیے تو دشا دھرم مہاجر خاندے واپس آگئی۔ ننھا محمود شیشے کا ٹوچلا رہا تھا۔ اس نے تلاتا تھکا کہ بھائی بھائی دشا کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی۔ دادا میاں نے شیشے کا یہ ٹوچلا بھیجا ہے۔ یہ ربر کی گیند، یہ رنگ دار مٹھائی، آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لانے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی۔ تلتے دار ٹوپی لائے گی۔

کراچی

دشاو نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گھما گھمی تھی  
ریفٹیو جی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پیٹ فارم پر جمع ہو رہی  
تھی۔ سارا اسٹیشن کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی  
طرح چھٹ گئی۔ پیٹ فارم پر کچھ تھی، کچھ باہر جانے والے مسافر، اور کچھ  
ملٹ چکی رہ باقی رہ گئے۔ آن کی آن میں ریفٹیو جیوں کا جم غفیر بے مایہ قطروں  
کی طرح کراچی کے محیط بے کراں میں غرق ہو گیا، جیسے سمندر کی تیز دست  
ہر ساحل کے خس و خاشاک کو اپنے قوت میں بہلے جانے یا جیسے سورج کی کرنیں



شبنم کے موتوں کو اپنے دامن میں چھپائیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گھٹی ہوئی مڑتی ہوئی ماسک کا تعفن گلاب اور موتی کی شیم کو اپنے سینے کے اندر جذب کئے

مور آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے — کھنٹی بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سندر کی لہریں ساحل کو چھیر چھیر کر ایک مدہوش سا باب بجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریت کے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نفرتی فواروں کی طرح جھللا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خشکی ایک نرم سی ملائت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر محمود سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان دسکی کے جام بھر کر سو ڈالار ہے ہیں۔ اے اے دلی — ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

سواد روستہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے۔ اے دلی دلی "دوسرے" نے دادیلا کیا۔

"کون جلتے ذوق یہ دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ہم نے دلی تیری خاک پاک کی کشش، قیسرا رانوں پر تھیر مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔ وہ دسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مرقبے میں گیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دلی کی نوحہ خوانی شروع کی، تو وہ چڑکا۔ — "ایں؟ یہ تو دہی سالی کراچی رہی۔

دلفی خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاؤری بازار میں چل سہل ہے۔ بی چاند جان کا بالا خانہ ہے اور وہ ساتی مہوش اپنی خالی آنکھوں میں ساغرا ٹھائے آ رہا ہے، لا رہا ہے آ رہا ہے۔"

اے اے دلی! اے اے دلی! اے بی چاند جان! دلی دلی چاند جان! دلی دلی چاند جان! — وہ چاروں ایک نفع دینے مریشے کی دھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنت الم کردہ کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ دیر پر سے ایک مقطع و متشرع بزرگ پان چار ہے تھے۔

ان کے آگے چند عقیدت مند دونوں بیٹھے تھے۔

"دلی گئی، دلی دے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا

پان لاؤ، بزرگ نے فرمایا۔



رب المصلین

ان کی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

”تبا کو تو اچھا ہے بھی۔ بزرگ نے رائے دی: کہاں سے لائے؟“

کسی نے عرض کیا: ”۶۹ روپے سیر ہے، مکھنوں سے منگوا یا تھا۔“

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی۔“ بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو

از سر نو پکڑا۔ ”دقی دے گئے، کیوں؟ جلنے ہو بھلا کیوں؟“

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ اسی کے چہروں پر کیوں کی سوالیہ

علامت شیعہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا: ”وہ لال قلعہ۔ وہ جامع مسجد، وہ قطب مینار

وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دغا سننے کے لیے ترس رہی ہے۔“

غالب کامزار، شیخ المشائخ حضرت نعام الدین ادویا، کامرہ قہ نور۔

سب چلے گئے۔ سب ہاتھوں سے نکل گئے۔ تم کو مجھے اپنے نصیب،

میں کتنا ہوں، اپنے اعمال، ہمارے اپنے ناگفتہ بہ اعمال، میں تم کو بتاتا ہوں

تقدیر تم کیا ہے؟ ————— پان لاؤ۔

پان حاضر کیا گیا۔

”میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر تم کیا ہے شمشیر و شان اول عاویذ زباب آخر“

رب مغربین

”دھت تیرے کی۔ دسکی دال پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا

تھا۔“ چاند جان میری تھی، وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ

تھی۔ —————

دوسرا جوان سوڑے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کر کے ایک عملی سا

جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر اٹا کھڑے ہونے کی

مشق فرما رہے تھے۔ ایک پارسن لڑکی ان کی حرکات پر قہقہے لگا کر فضا میں

ایک لہریہ سا ترنم، ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے تھانے کا

رنگین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس بیدنگ کا سیٹوم میں اس کا پھریرا بدن توں

کی طرح تپا ہوا تھا۔ ————— بزرگ فرما رہے تھے ————— پان لاؤ

چیت کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان ہمارا تھانہ گاڑھی کابٹ پیرے

پر چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب

نہ آئے پائیں۔ دو سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس

کی لاشی پھیننے کی کوشش کی، دوسرے نے اس کی یٹک کو اڑا نا چاہا۔ جب

وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی ردھی ٹوپی آٹا کر بُت کے سر پر رکھ دی اور دھوٹ خوش دہاں سے چل دیے کہ انہوں نے چپکے چپکے اس بُت کو مسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ دو بے کے ٹرک چمڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی پٹیاں ————— سامان میں ایک طوطے کا پتھر بھی ہے۔ طوطا مڑکی پھلیاں کھا رہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ سو سالہ میں بھی چلا — اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو ————— ؟

قصر ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ ہوٹل کے میجر نے بیسج پر آکے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی تا مدام غنم ریلینٹ منسٹ میں دی جائے گی، لوگوں نے گرم جوشی سے تالیاں بجا لیں۔

میراجی کراچی سے اُٹا گیا ہے۔ ایک دیدہ زیب بیگم نے شیریں کاٹکاس رباعین سے لگا کر کہا: چلو ڈیڑ کچھ روز کے لیے ہمیں گھوم آئیں۔

اس کا ساتھی شمیم پی رہا تھا: اب تو ہمیں بھی مرحوم ہو گئی بیگم۔ سانی کانگریس اس پیرس صغریٰ کو رہا ہو خانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے نہ دسکی نہ شیریں، نہ جن نہ شمیم — اب سننا ہوں کہ ریس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے؟

”اسے ہاں“ بیگم کو ایک ایک یاد آیا: ابھی اگلے روز پروفیسر خٹنام کا خط آیا تھا۔ پروفیشن کے اٹھوں بے چارہ مجبور ہو گیا ہے۔ ایک کیس دسکی منگوائی ہے، کسی طرح بھوادو، ڈیڑ۔

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے سرگوشی کر رہا تھا: مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں:

”مجھے تین“ دوسرے نے کہا

”پارسی لڑکیاں اور مسلمان عورتوں کے برقعے“

”مجھے برقعے وایاں بھی پسند ہیں“

”واحد بڑے کو مذاق ہو، ان حقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا؟“

”انہیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم مجھے یہ ہمارے حسن پسند ہے۔  
پیلے پیلے گالوں میں نیلی نیلی رنگوں کی لکیریں، اس پر غارے کا خمار —  
خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں — ہائے میں نے ایسا حسین امتزاج  
کیس نہیں دیکھا — بوائے دو سو ڈاڈو دسکی۔“

”ایک ہی بات ہے تم پلاؤ یا میں چاؤں — ہمارے  
دونوں ملکوں کا بندہ نصیباً لعین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے  
کی ہر ممکن کوشش کریں گے — تمہاری صحت کے لیے۔“  
ایک مسلمان ایڈیٹر لین سکوائٹس سے جی بھلا رہا تھا۔ موقع پا کر وہ  
شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔

”میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب  
کی کھپت پہلے سے گنتی ہو گئی ہے؟“ ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے  
مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔

”غلط“ تاجر نے گرجوٹی سے تردید کی۔ ”بالکل غلط“ آپ بھی کیس  
جیب افواہیں لے اڑتے ہیں۔ گنتی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔“  
”انسوس“ ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ ”کیا یہ امر اس نئی اسلامی حکومت

کے لیے شرمناک نہیں؟“

”پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور مسلم ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے۔“  
”تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی؛  
”کیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں؟“  
ایڈیٹر صاحب برابر مقرر تھے۔

”بقلم“ تاجر نے دسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”آپ ریاست  
بنارہے ہیں مسجد نہیں۔“

”وہ کالے کالے بڑھے۔“ دوسرے غیر ملکی سیفر کا میکرو ٹری پیلے غیر  
ملکی سیفر کے میکرو ٹری سے کہہ رہا تھا۔ ”سرخ و سبز ریشم کے سرمے ہونے  
نقاب، برقعوں کی اوٹ میں بھانکتے ہوئے گول گول پیلے پیلے لال لال  
پہرے، سڈول بانہیں۔ ریشم کی تموں سے جھلکتے ہوئے مخروم ہاتھ —  
کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے برقعے

کیس نہیں دیکھے۔ جب میں انہیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بھلیاں  
گڑاتے دیکھتا ہوں، یا گاندھی گارڈن کے سبزے پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے  
پاتا ہوں، تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گرجاؤں



یا خدا

اور ان کے نازک اور بیک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روز دتے چلے جاتیں  
روز دتے چلے جاتیں —————

’جوتے دوپگ دکی اور سوڈا‘ پیلے نے آواز دی۔

اس بار میری طرف سے۔ ’بوائے‘ دو سوڈا‘ دو دسکی‘ دوسرے

نے کہا۔

’ایک ہی بات ہے‘ تم پلاؤ‘ یا میں پلاؤں — ہمارے ہادر ملکوں کا  
نصیب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی کیاں  
مرد کریں گے‘

’یہ دونی کھوٹی ہے‘ جی‘ بس کے کٹہ کٹنے کر خٹکی سے کھا۔

اسے بدل دو‘

یہ دونی میں نے نہیں بنائی‘ پنجابی پتھر نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔  
میں یہ دونی کوئی دتی یا لکھنؤ سے نہیں لایا۔ میں تمہیں ہرگز دوسری دتی  
نہ دوں گا‘

کٹہ کٹنے میں روک دی۔ جب تک تم مجھے دوسری دتی نہ دو گے

رب العالمین

یہ بس آگے نہیں جائے گی‘

کچھ پنجابیوں نے کٹہ کٹہ کو چند فصیح و بلیغ گایاں دیں‘ ’مابے سندھی‘  
مفت کا پاکستان مل گیا سالوں کو‘ ہم بھی دودن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں  
گے‘ ہاں‘

کٹہ کٹہ اور ڈرا تیر باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے‘ ’مابے  
پنجابی پٹ پٹا کر میاں آتے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پر ہی چڑھے  
آتے ہیں‘ سورتے بچے‘ جیسے ان کی ماں کے ختم کا گھر ہے یاں‘  
ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے  
کٹہ کٹہ اور ڈرا تیر کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو ہنگامی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

’لارنس روڈ کو کتنی دور ہے جی‘ ایک نے پوچھا

’یہی کوئی دو فرلانگ اور ہوگی‘ دوسرے نے امانہ لگایا۔

’آؤ ٹھلٹے ہی چلیں‘

جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انھوں نے  
دونوں واسے حادثہ پر جی کھول کر تبصرہ کیا۔ ’لڑنے دو‘ مابے سندھیوں



اور پنجابیوں کو کہتے ہیں پاکستان کی زبان اُردو ہوگی، چھی، گویا شرف و بگلا  
بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں... چھی

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا، ایک چھابڑی دلے پر گرج  
رہا تھا۔ تم یہ گندے کیسے میاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں  
آتی ہیں۔ اُن ————— اُن —————  
”لبے چلی، ہوٹل کے بچے“ چھابڑی والا اکڑ رہا تھا۔ یہ پڑھی تیرے  
بادا کی ہے؟

ایرانی نژاد ہوٹل دلے نے پاؤں کی ایک بھر پور ٹھوکر سے کیلوں کی  
چھابڑی الٹ دی۔ چھابڑی والا پلک کر اس کی ٹانگوں سے چٹ گیا۔  
ایک کانسٹیبل نے آکر چھابڑی دلے کے منہ پر زور کا پتھر مارا۔ سالے  
حرامی کتنی بار کہہ ہے، میاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرام زادے  
چلو، تھانے چلو۔

چھابڑی دلے نے گڑ گڑا کر خوشامد کی، کہ وارو غبجی، میں احیر شریفیت  
سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار سب ٹٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ

ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر میاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجیری کا اقدار ہے  
نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی تیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا  
فرض منصبی بڑے احسن طور پر انجام دیا اور چھابڑی دلے کو آگے لگا کر  
تھانے لے گیا۔ جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل  
سنی تو اسے کانسٹیبل کی نالافتی پر برا عقیدہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن  
کو بھی ساتھ ہی لے آئے۔

”دو اور دو چار ————— چار اور تین سات ————— سات  
اور نو کئے ہوئے؟“ چیلارام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا  
خوشی محمد دلال چلنے سے کھتی نکال کر چھپ چھپک رہا تھا۔ اذہ مونی  
کبھی کو فریش پر گرا کہ اس نے چائے کا ایک ببا سا گھونٹ بھرا۔  
سات اور نو سولہ“ چیلارام نے خود ہی حساب لگایا۔ میں نے کہا  
”استاد“ میزن برا نہیں رہا۔“

خوشی محمد دلال نے اپنا ٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک اور

بیا سا گھونٹ لیا۔

”سچ پوچھو دوست تو بڑا گراہ میزن لگا تھا۔ چیلارام کے گالوں کی پگوریاں خوشی سے پھول رہی تھیں۔ ایک میزن میں سولہ چھوکریاں آرام قسم میں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا۔“

ایمان قلب کے اظہار کے طور پر چیلارام نے چاند تار سے والی جناح کیپ آوار کر اپنی گتھی چنڈیا کو زور زور سے سہلایا۔

خوشی محمد کا لٹکا ہوا اچھلا ہوٹ اور بھی ٹپک گیا۔ اور دھول کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

”تم سارے قسمت کے دھنی ہو۔“ خوشی محمد منمنایا۔ ”چھو کر پوچھو کری تمہارے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔“

”تین چھوکریاں! تھو! چیلارام نے طنز آریسٹوران کے فرش پر بیٹھ کر ایک بڑا سا غلفہ تھوک دیا۔“ کالی کالی پور نہیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا تھو۔ میرے پاس بڑے انمول دانے تھے۔ یا۔۔۔ گرم گرم سنت سنت چٹا نہیں۔ نازک پلکار دتی دایاں اور پھر وہ پیٹے والی جٹنی، ہائے دانے میرا تھی، خوشی محمد میرا!“

چیلارام نے ایک کھارابکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔  
”وہ سالہا براؤن اسے پورٹ سید سے گیا۔ کتنا تھا، بڑا کام دے گی وہاں۔“  
”میں نے کہا خوشی محمد یہ پورٹ سید کس طرف ہے؟“  
”ہوگی کہیں۔“ خوشی محمد کا بیروں پر ذرا مذا تھا۔ ”چائے شگواؤ اب تو کوئی سالی ریفریجیٹرین بھی نہیں آتی۔“

گرم چائے کے دوسرے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ چیلارام دفاتر اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قاہرہ — لندن — پورٹ سید —  
نہ جانے اس کے بیش قیمت تحفے کس کس شہستان کی ذینت بنے ہوئے تھے کسی دھندلے آرا نگاہ میں اس پٹیائے والی جٹنی کا جسم بھی ریشم اور کھواب کے گانے کی طرح سجا ہوا ہوگا۔ چیلارام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سراٹھار رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا، کہ وہ پُر لگا کر پورٹ سید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ ملے براؤن کے منہ پر مار کے پیٹے کی جٹنی کو واپس لے لے اور اس کے گتے ہوتے

نہیں گاؤں کیسے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آئے۔ مہمانوں سے  
 لڑتا ہوا، سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہوا، پہاڑوں کی چھاتی کو پھیرتا ہوا —  
 خوشی مہم دلال کی دنیا میں غم اور غصے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو  
 یہ سارے ریغیو جی ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر رہتے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر  
 ٹرینیں لہی آتی تھیں — لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ  
 ہر روز اخباروں میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا — دلی میں خون —  
 — کانپور میں خون — گلگتے میں خون — احمد آباد میں  
 خون — اجیر میں خون — لیکن اس سارے خون  
 کے سبب میں ایک ریغیو جی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی مہم دلال کو اس  
 بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موبوم سی امید کا سہارا سے کر  
 چھ پیسے کا خون کیا اور اخبار کی سبلی سرخیوں پر بھائی ہوئی غور و خفا کی اخبار  
 بیچنے والا چھو کر اٹھ پھاڑ پھاڑ کر بیچ رہا تھا۔ اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی  
 — جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا۔ — اب تو —  
 خوشی مہم دلال نے ہر دن شوق ہو کر خبریں پڑھیں کشمیر کی جنت میں بھی  
 دوزخ کے شے بھڑک اٹھے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔

چوہوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ ڈوگرہوں کی تنوار  
 چل رہی تھی۔ ہزاروں مرگے تھے، ہزاروں مردے تھے، ہزاروں سینڈ کول کی  
 طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رنگ رنگ کر اس آتشکدہ جہنم سے  
 باہر بھجنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی مہم نے چیلارام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ اب تو کشمیر میں  
 بھی لگ گئی، میرے بارے میں تھے کہا، چیلارام، ڈراؤں تو  
 چیلارام پورٹ سعید کے تصور میں گمن تھا۔ پھر تو سبب منگے ہو جائیں  
 گے؟ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

لیکن خوشی مہم میں شاعر کی روح جل کر آئی تھی، اس نے چٹخارے  
 سے کر کشمیر کی نازک بدن، نسیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت  
 رنگین، معذرت عرضیں — جن کے گلوں میں سبب ہوتے  
 ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگوڑا کاس۔ آنکھوں میں ڈل کی  
 ہروں پر قصہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھروں کا سرود۔ اٹک اٹک ہیں  
 گلاب اور موتی کی رنگت۔ زعفران کی بھینٹی بھینٹی رنگ —  
 چیلارام دلال کے منہ سے رال ٹپکتے گئی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور



خوشی محمد کے لیے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر میچے گئے اور کشمیر کے میزن کی امید افزا رعایتوں میں کھو گئے۔

ہوا کے تھپیڑوں سے بادیاں ہلایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا قلم اٹھا۔ کشتی ڈلگائی اور وہ سم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔ سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھانسا اٹھا اور پان کی پلک جو کچھ عرصہ سے اس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی بے اختیار بدھ دے گند سے پانی کی طرح بہ نکلی۔

بوڑھا محتاج بیڑی سلگا کر مسکرایا: "کشمیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے۔ بچاری! جی ڈرتی ہے، 'لو، لو' کس طرف چلوں؟ پیرکس یا ونیس؟"

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلاویز باتیں سن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈلگائی ہوئی کشتی میں اتنے بے سفر پر جلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا چنانچہ جب محتاج نے اسے پیرکس یا ونیس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔ چنانچہ محتاج اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرایا: "گھبراؤ نہیں سیٹھ، دُور نہیں

سے جاذب لگاؤ! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاد گئے! ۴

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چل چلی تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے هجوم اور اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا، کوئی سینڈرپٹ آئی لینڈ۔ اور ایک جہاز مبینہ جانے کے لیے نگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھر پھڑا رہی تھیں۔ لوگ دور بینیاں اُنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا تو کچھ لوگوں نے اپنے سردوں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسنے لہرا لہرا کر بے ہند "کانعرہ لگایا۔

کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے علی ایک گرمی سوج میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب لہروں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈلگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکار یاد آتا، ہوا سی طرح ڈلی اور دوسری نازک لہروں پر تھر تھرا کر تاتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اسے تھکے آگئی۔

— اُت! اتنا کروا پانی تھا۔ ڈل لاپانی تو تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور پشہ شامی کا پانی۔ بٹے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کو دی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا صاف؟



یا خدا

نیلا ہے یا سبز؟ لیکن اسے اس کی آنکھیں! ایک دن تھا کہ اس کی غلافی آنکھوں میں  
جھیل دودھ کی لطیف نیلا ہٹ اور پکے باداموں کی نازک راحت ہو کر قی تھی لیکن  
اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور ایک کنویں کسی دور  
دراز ویرانے میں کھوتے پڑے ہوں۔ اب وہ اندھی تھی بے بصر تھی ایک  
بادلوں کو گرنے اپنی سنگین سے اس کی آنکھوں میں بے ہوشے ہستی نگ مٹا کر دیتے تھے  
سائل کے ہنگامے سے دُور ایک کلمے رنگ کا جواز سمندر میں تنہا کھڑا تھا  
اس پر سرخ رنگ کے جل حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب اس کی کشتی  
پاس سے گزری تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا معانے  
دور لگا کہ کہیں یہ بارود بھجک سے اڑ نہ جائے۔ جب کشتی ذرا دور نکل گئی  
تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی قند پر رکھ لیے۔  
کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی  
جھونپڑیاں تھیں، علاج نہ بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پر یہ ہے اس پاس  
اور بھی چند جزیرے تھے، ان کے ساحلوں پر بھی اکا دکا کشتیاں کھڑی تھیں۔  
کہیں دینس تھا، کہیں فیپلز۔ کہیں روم۔  
علاج نے بادبان کھول کر کشتی پر ایک، سا بان ساق دیا۔ پھر اس نے سیٹھ

رب العالمین

قائم علی دائم علی کو آنکھ ماری۔ "تو سیٹھ" میں تو پھیلیاں پکڑنے چلا۔ تم  
مڑے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو۔

عید گاہ کے میدان میں ایک پناہ گاہ ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے  
ہر شب شب برات، انماٹ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے چراغ  
ٹمٹما رہے ہیں، گوشت روٹی، بٹے ہوئے کپڑے، پرانے بوٹ، تازے پھل، بڑے  
کی میٹیں، لکڑی کے صندوق، چمڑے کی کرسیاں، تیل، اجاز، صابن۔ بے گھر  
اور بے درمجا ہمارے کی ہر ممکن لڑی تمام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب  
قسم کا اطمینان، ایک عجیب قسم کی ابدیت، اس ماحول پر جاری و ساری ہے۔  
جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزل مقصود  
پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دوختے کیے ہوئے ہیں۔ سامنے کی طرف دُشاد  
پکڑیاں تل رہی ہے پھللی طرف زبیدہ وہی بڑے دگھے بیٹھی ہے۔  
ایک مہترنگا چٹان پکڑیوں کے سامنے پھسکا مارے بیٹھا ہے۔  
گرم گرم پکڑیاں ہیں، خان۔ کھاو۔ بو بو کھنے کی دوں؟

نرم ہے، 'خو' گرم ہے؟ پٹھان نے آنکھ ماری۔

۱۱ خان! نرم ہے، خرگرم ہے! دشاؤ کو کچھ منہ کے سامنے کر کے مسکرائی  
دشاؤ کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو  
کر رحیم خاں نے قسم کھالی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اُسے اٹھالے جائیں  
تو وہ ارض و سما کی دستیں بچاؤ کر اُسے چھین لائے گا۔

پنھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "خود ایک روپیہ؟"

”نہیں خان، خود پانچ روپیہ۔“

‘ہٹ، خر، دھاتی روپیہ؟’

خواپانج :-

چٹان نے اپنی جیب کے پیسے گنے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے تھے اس نے پونے دو روپے کا ادھار کرنا چاہا لیکن دلشاد نے اُسے مجبور کر دیا کہ خان قرضِ محبت کی قیچی ہے تم پیسے پورے کر لاؤ۔ میں تمہیں جھٹ پٹ نرم نرم گرم گرم کیڑیاں اتار دوں گی۔

پنجان مایکس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے دہی بڑوں کا سودا کیا۔ زبیدہ ابھی بچہ تھی، نادان تھی، معصوم تھی، اس لیے وہ پوتے و ورے کا ادھار

مان گئی۔

زبیدہ نے دشا کو آواز دی۔ "بہن ڈرا اس عورت دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔ میں ڈرا خان کے ساتھ جا کر دھی بے آؤں۔"

اسی طرح جب دُشاد بھی اپنی پکڑیوں کے لیے مین لینے کسی گا ہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو نہ بیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ وہی اور مین کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملت کا مستقبل پر دان چڑھ رہا ہے۔ جب دُشاد کی بچی نرم نرم، گرم گرم پکڑیوں پر چل کر جوان ہوگی۔ جب نہ بیدہ کا محمود وہی بُمدی کی چاٹ پر سیانا ہوگا، تو اسام کی برادری میں وہ گرانفت درکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوبصورت مین ————— جسم کی مضبوطی کا اور جسم کی خوبصورتی ! یہی تو وہ اینٹ اور گارا ہے جس سے بادِ قو میں تعمیر ہوتی ہیں ————— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی ! یہی تو وہ نعمتِ غفلتی ہے، جو نعمتوں والے عظمیوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ وہی مشرق کا

یا خدا

مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر خرے اور انار  
لگائے۔ وہی دریاؤں سے موق اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنت کا  
رحمان ہے 'وہی دوزخ کا قمار ہے۔ ————— پھر تم اپنے پروردگار  
کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟